محمد سرور

عربی و دینی مدارس کی اصلاح کی کوششیں

المعارف کے جنوری ۱۹۷۰ء کے شمارے میں مولانا خواجہ الطاف حسین حالیؒ کا ایک مضمون عربی و دینی مدارس کے نصاب تعلیم کی اصلاح کے بارے میں شائع ہوا تھا۔ مولانا حالی یہ مضمون ندوۃ العلماء کے اجلاس منعقدہ اپریل ۱۸۹۴ء میں پڑھنا چاہتے تھے لیکن بعض موانع کی بنا پر وہ خود اس اجلاس میں شریک نہ ہوسکے اور مضمون کسی اور صاحب نے پڑھا۔

مولانا حالی نے اپنے مضمون میں صرف عربی و دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے متعلق بحث کی تھی اور اس سلسلے میں چند تجاویز پیش کی تھیں۔ آپ نے فرمایا تھا کہ پچھلے پچاس برس سے مسلمانوں کی حالت میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا ہے۔ ایسی حالت میں عربی و دینی مدارس میں بعینہٖ وہی سلسلہ درس قائم رکھنا جو قدیم زمانے سے چلا آتا ہے اسلام کے حق میں مفید نہیں ہوسکتا۔ پس ہمارے علما کو چاہیے کہ بہ مشورہ و صلاح ہمدگر مدارس اسلامیہ کے سلسلۂ درس پر غور کرکے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں کے موافق اس کو از سر نو مرتب کریں۔ آپ نے اصلاح نصاب کے ضمن میں طلبہ کے اندر عربی زبان میں گفتگو کرنے اور عربی عبارت لکھنے کا ملکہ پیدا کرنے کی ضرورت بتائی۔ اور عربی ادب کی تعلیم پر زور دیا۔ نصاب تعلیم میں جو نئے مضامین داخل کرنے کا مولانا نے مشورہ دیا تھا ان میں ایک تو تاریخ و جغرافیہ تھا اور دوسرا ریاضی۔ ریاضی کے متعلق مولانا حالی نے لکھا: ریاضی کی تمام فروع میں مسلمانوں نے اپنے زمانے کے موافق انتہا درجہ کی ترقی کی تھی، اور اب ریاضی سے مسلمانوں کی نامناسبت ضرب المثل ہوگئی ہے۔ اور اکثر اسلامی مدارس میں تو ریاضی کی ایک کتاب بھی نہیں پڑھائی جاتی۔

قدیم ہیئت کی بہت سی چیزیں اب غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ مولانا حالی نے اپنے اس مضمون میں تجویز فرمایا کہ ہمیں جدید ہیئت کو بھی شامل نصاب کرنا چاہیے "تاکہ دونوں ہیئتوں کے مقابلہ کرنے کا موقع ملے اور ان میں سے جو ہیئت غلط ثابت ہو اس کو ترک کریں، اور جو ہیئت صحیح ہو، اس پر اپنے علم کی بنیاد رکھیں۔

ہمارے ہاں غلطی سے ہیئت قدیم کے بعض تصورات کو اسلامی عقائد کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ چنانچہ

جب جدید ہیئت نے ان تصورات کو غلط ثابت کیا تو بعض مذہبی طبقوں نے جدید ہیئت کے ان انکشافات کو یہ کہہ کر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ اسلام کے خلاف ہیں ۔ مولانا حالی نے عربی و دینی مدارس میں ہیئت جدید کو درس میں شامل کرنے کی تجویز کرتے ہوئے لکھا: ہیئت جدید کو یہ سمجھ کر کہ وہ نصوص قرآنی کے خلاف ہے، ترک کرنا اور اس سے دین میں فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ کرنا گویا اس بات کا تسلیم کرنا ہے کہ دین اسلام اس کے حملے کی تاب نہیں لا سکتا۔ جو لوگ دین اسلام کو دین برحق اور خدا کا بھیجا ہوا دین سمجھتے ہیں، ان کا یہ اعتقاد ہونا چاہیے کہ اگر ہیئت جدید سچی ہے تو یقیناً وہ اصول اسلام کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ اور اگر وہ اصول اسلام کے خلاف ہے تو یقیناً جھوٹی ہے۔ اور ہم ضرور اس کی غلطی اور جھوٹ ثابت کر سکیں گے لیکن اس بات کے دریافت کرنے کے لیے کہ وہ غلط ہے یا صحیح یا اصول اسلام کے خلاف ہے یا نہیں، ضرور ہے کہ اوّل اس کا علم حاصل کیا جائے۔ چنانچہ مولانا حالی کا اصرار تھا کہ ہیئت جدید کو درس میں ضرور داخل کرنا چاہیے۔ تاکہ اگر وہ فی الواقع اصول اسلام کے خلاف ہو تو ہمارے علما کو اس کے ردّ کرنے کا موقع ملے۔

غرض برعظیم پاک و ہند میں عربی و دینی مدارس میں مروجہ نصاب تعلیم کی اصلاح کی تحریک باقاعدہ طور پر کوئی اسّی نوّے سال سے جاری ہے۔ اس کی ابتدا ندوۃ العلماء کی تحریک سے ہوئی۔ اس وقت عربی و دینی مدارس کی کیا فضا تھی۔ اور ان میں کیا پڑھایا جاتا تھا۔ سیرت مولانا سید محمد علیؒ[1] مونگیری بانی ندوۃ العلماء میں اسے یوں بیان کیا گیا ہے:

"اس نصاب درس اور طریقۂ تعلیم کی وجہ سے ان (علما) کے سامنے کوئی ایسا تعمیری اور انقلابی میدان نہ رہا جہاں زندگی کی صلاحیتوں اور طاقتوں کا مظاہرہ ہوتا ...... نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی صلاحیت ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق، فروعی اختلافات، جماعتی عصبیت، علمی طبقہ داریت کی نذر ہو کر رہ گئی ..... ہندوستان کے مقتدر علما اور نامور شخصیتوں پر کفر کے فتوے لگائے گئے ..... پوری امت مقلدین اور غیر مقلدین میں تقسیم ہو گئی۔ اہل حدیث اور اہل فقہ کے دو الگ الگ گروہ بن گئے اور ایک دوسرے سے اس طرح برسرپیکار ہوئے کہ گویا وہ دو مختلف مذاہب کے پیرو ہیں۔"

یہ انیسویں صدی کا اواخر تھا۔ ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز واقعات کو گزرے جنھوں نے مسلمانان پاک و ہند کی جمعیت کو بالکل تتر بتر کر دیا تھا، کوئی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس وقت ایک طرف

---

[1] مصنفہ سید محمد الحسنی، ناشر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (ہندوستان)

اسلام پر عیسائی مشنریوں کی طرف سے یلغار ہو رہی تھی - اور دوسری طرف آریہ سماجی اسلام پر نازیبا حملے کر رہے تھے - برعظیم میں اسلام اور مسلمان اس نرغے میں تھے - اور جو اس نازک وقت میں ملت کی حفاظت کر سکتے تھے، ان کی حالت مولانا سید محمد علی مونگیری کے سیرت نگار کے الفاظ میں یہ تھی :

"ساری طاقت آمین بالجہر، قرأۃ فاتحہ اور رفع یدین کے نقض یا اثبات پر صرف کر دی گئی۔ فقہ کے جزئیات اور مختلف فیہ مسائل میں جن پر اسلام کی بقا و ترقی کا انحصار نہ تھا، ضخیم مناظرانہ کتابیں تیار ہونے لگیں۔ مناظرے ہوئے - اور طنز و تعریض کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہو گیا - اور یہ معاملات صرف مناظروں تک محدود نہ رہے بلکہ تقلید و عدم تقلید پر مقدمہ بازیاں عدالتوں تک پہنچیں جن میں فیصلہ صادر کرنے والے غیر مسلم ہوتے تھے ۔"

وہ ملت جس کے بارے میں ارشاد ہوا تھا کہ اس کے افراد ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں جیسے ایک جسم سے اس کے اعضا ہوتے ہیں - اور اس کے تحت حکم ربانی تھا کہ وہ اس کی رسی کو مضبوطی سے پکڑیں، اس کی یہ حالت ہو گئی کہ "یہی قوم دیکھتے دیکھتے "بأسهم بينهم شديد" کی زندہ تصویر بن گئی اور مختلف صفات اور صلاحیتوں کے افراد جو ایک لڑی میں پیوست تھے، باہم دست و گریبان اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آنے لگے - اس کے علاوہ امت میں دو گروہ اور بھی تھے جو اس وقت ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے - اور وہ تھے جدید اور قدیم گروہ - ایک گروہ ہر نئی چیز کو خیر و صواب سمجھتا تھا اور دوسرے کے نزدیک قدامت بمنزلہ تقدس کے تھی ۔"

اس انتہائی افسوس ناک صورت حال کی اصلاح کے لیے ۱۸۹۲ء میں کانپور میں علما کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی - دوسرے سال کی کانفرنس میں ایک مجلس ندوۃ العلما کے نام سے وجود میں آئی - اس کی تنظیم میں ایک تو ہر مکتب خیال کے علما منسلک تھے - دوسرے اس کے سالانہ جلسوں میں جہاں علما شریک ہوتے وہاں جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی مدعو کیے جاتے اور علما کے ساتھ ساتھ وہ بھی حاضرین سے خطاب کرتے - مختلف مکاتب کے علما اور پھر علما اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لیے اس طرح کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم فراہم کرنا اس زمانے میں بہت بڑا انقلابی اقدام تھا اور یہ محض تحریک ندوۃ العلما کی بدولت ممکن ہو سکا - اس کے علاوہ ندوۃ العلما کی اس تحریک کے پیش نظر عربی اور دینی تعلیم کے نصاب اور طریقے کی اصلاح بھی تھی -

دراصل اس تحریک کا بنیادی مقصد یہی تھا - اس تحریک کے بانی مولانا سید محمد علی مونگیری نے بالکل

ابتدا ہی میں اپنی ایک تحریر میں اس ضرورت پر زور دیا تھا۔ انھوں نے عربی و دینی تعلیم کی فرسودگی اور اس سے فارغ التحصیل ہونے والوں کی بدحالی اور کس مپرسی کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں خود علما میں جو نزاع باہمی اور جماعتی عصبیت پائی جاتی تھی اسے بڑی دل سوزی سے یوں بیان فرمایا: "اب خیال کیجیے، مقلدین وغیر مقلدین میں کیسی شرمناک لڑائیاں ہوتی ہیں۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کی جان کا، مال کا، آبرو کا کس طرح خواہاں ہوتا ہے۔ خلاف مذہب والے کے اجلاس میں مقدمات جاتے ہیں۔ ہمارے محترم علما مجرموں کی طرح سامنے کھڑے ہوتے ہیں، صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث ان کے جوتوں کے پاس ان کے پیچھے ڈھیر ہوتی ہیں۔ اور آمین اور رفع یدین کی تحقیق جوبے گھنشام داس صاحب بہادر اور کرمول صاحب بہادر کے روبرو پیش ہوتی ہیں، اس کو دین خیال کیا جاتا ہے۔" (روداد دارالعلوم سال اوّل)۔

ندوۃ العلما تحریک کے ان روشن خیال علما کے اس اقدام کی اس وقت کافی مخالفت بھی ہوئی، لیکن اس کے باوجود ندوۃ العلما کے ہندوستان کے مختلف شہروں میں سال بہ سال جلسے ہوتے رہے اور اس طرح اس کا پیغام برعظیم کے ہر حصے میں پہنچا۔ آخر ۱۸۹۸ء میں لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلما کا ابتدائی درجہ قائم کر دیا گیا، اور اسی نے آگے چل کر موجودہ دارالعلوم ندوۃ العلما کی شکل اختیار کی۔

بے شک اس زمانے میں ہمارے ان بزرگوں نے یہ ایک بڑا انقلابی قدم اٹھایا تھا۔ لیکن جب تحریک ندوۃ العلما کو عملی شکل دی جانے لگی اور اس کے دارالعلوم کے لیے ایک اصلاح شدہ نصاب تعلیم بنانے کا مسئلہ زیر بحث آیا تو علمائے کرام میں اختلاف رونما ہوا۔ جہاں تک قدیم نظام تعلیم اور جدید نظام تعلیم کا تعلق تھا، ان دونوں کی راہیں اس وقت بالکل معین ہو چکی تھیں۔ عربی و دینی مدارس میں قدیم نظام تعلیم رائج تھا۔ اور جدید نظام تعلیم کے لیے ملک کے ہر حصے میں سکول اور کالج کھل رہے تھے، اور یونیورسٹیاں قائم تھیں۔ اب دارالعلوم ندوۃ العلما کے لیے ایک ایسے نصاب تعلیم کی تلاش تھی جو کھڑا تو قدیم نظام تعلیم کی بنیادوں پر ہو، لیکن اس میں جدید علوم کے ضروری حصے بھی داخل کیے جائیں۔ بدقسمتی سے تحریک ندوۃ العلما کے زعما کا اس پر اتفاق نہ ہو سکا۔ اور قدیم اور جدید طریقہ ہائے تعلیم کو سمویا نہ جا سکا۔ یہ نہ اُس وقت ہو سکا۔ اور نہ آج ہو پایا ہے۔ اگر نئے نصاب تعلیم میں قدیم درسیات کا حصہ غالب رکھا جاتا ہے تو جدید طبقے بدک اٹھتے ہیں۔ اور اگر جدید علوم

کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے تو قدیم درسیات کے حامی بدظن ہوجاتے ہیں۔ یہ کش مکش کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اور صحیح کی راہ پر اب تک ملت جادہ پیما نہیں ہوسکی۔

کتاب "مولانا سید محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء" کے مصنف قدیم وجدید کے درمیان اس کش مکش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "مولانا شبلی جو بعد میں تحریک ندوۃ العلماء میں شریک ہوئے تھے، چاہتے تھے کہ قدیم نصاب میں جن تبدیلیوں کی ضرورت ہے، وہ سب کی سب قبول کر لی جائیں۔ قدیم تعلیمی ڈھانچہ یک قلم منسوخ کردیا جائے اور انگریزی کا باقاعدہ تعلیم کا پورا انتظام کیا جائے لیکن مولانا محمد علی مونگیری اس عجلت کو نہ مفید سمجھتے تھے نہ ممکن۔ وہ تدریجی طور پر اور نرم روی کے ساتھ تبدیلیوں کے حامی تھے۔ ان کے ساتھ اور دوسرے مدرسین اور عہدیداران بھی اس عجلت اور انتہا پسندی کے حق میں نہ تھے"۔ غرض پالیسی کا یہ اختلاف انداز فکر اور ذہن ومزاج کے اختلاف سے مل کر رفتہ رفتہ شدت اختیار کرتا گیا اور یہ خلیج آہستہ آہستہ وسیع ہوتی گئی اور آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ عربی ودینی مدارس کے نصاب تعلیم کی اصلاح کی یہ تحریک عام نہ ہوسکی، اور نہ صرف قدیم تعلیم اور جدید تعلیم کے ادارے ایک دوسرے سے الگ تھلگ اپنی اپنی راہوں پر چلتے رہے بلکہ خود قدیم تعلیم اور اس سے متعلقین میں کوئی وحدت نہ پیدا ہوسکی اور پہلے کی طرح ان میں فرقہ پرستی کا دور دورہ رہا۔ ہر فرقے کی اپنی اپنی درس گاہیں ہیں۔ ان کا نصاب تعلیم فرقہ وارانہ بنیادوں پر مرتب ہوتا ہے۔ اور تعلیم میں بھی اپنے ہی فرقے کے عقائد وخیالات کو ترجیح دی جاتی ہے۔

غرض عربی ودینی مدارس کے نظام کار اور نصاب تعلیم کے ناکارہ اور فرسودہ ہونے کا احساس گزشتہ صدی میں ہوچکا تھا اور اس کی اصلاح کی کوششیں بھی اسی زمانہ میں کی جانے لگی تھیں، لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ان مدارس کے نصاب تعلیم میں جدید مضامین، جنھیں حاصل کیے بغیر آج زندگی کی معمولی ضرورتیں تک پوری نہیں کی جاسکتیں، کیا داخل ہوتے، اس سلسلے میں اتنا بھی نہ ہوسکا کہ ان مدارس کی تعلیم اور ان کے استادوں اور طالب علموں کی فرقہ واریت کا تنگ ومحدود دائرۂ فکر کچھ وسیع ہوجاتا اور ان میں خالص ایک فرقے کی دینی تعلیم پر اکتفا نہ کیا جاتا۔ لیکن افسوس اسی نوے سال کی طویل مدت میں اتنا بھی نہ ہوسکا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ ان مدارس کی فرقہ وارانہ تعلیمی فضا میں مزید گھٹن پیدا ہوتی گئی۔ یہ مدارس کلیتہً الگ الگ فرقوں کے ہیں۔ اور ہر فرقے کے طلبہ اپنے ہی فرقے کے مدارس میں تعلیم حاصل

کرتے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں جب مملکت پاکستان معرض وجود میں آئی تو اسے برعظیم کے مسلمانوں کی عربی و دینی تعلیم کی یہ ساری روایات ورثہ میں ملیں۔ شروع کے چند سال گزرنے کے بعد ہمارے ہاں بھی اس تعلیم کی تمام خرابیاں اور ان سے پیدا ہونے والے فرقہ وارانہ ہنگامے قومی زندگی میں گھس آئے۔ ہم بجائے ایک متحدہ ملت ہونے کے مختلف فرقوں میں بٹتے چلے گئے اور ان کے درمیان فرقہ وارانہ نظریاتی جنگ شروع ہو گئی۔ اس روز افزوں فرقہ وارانہ منافرت کا سب سے بڑا سبب یہی فرقہ وارانہ مدارس اور ان کا نصاب و نظام ہے۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے امیر مولانا محمد اسماعیل صاحب نے، جو اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں، ۱۹۶۴ء کے اواخر میں ایک دفعہ لائل پور میں اور پھر مشرقی پاکستان میں اہل علم سے خطاب کرتے ہوئے عربی و دینی مدارس کی اس زبوں حالی اور ان کے نقصان دہ نتائج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"ملک میں دینی مدارس کی کافی تعداد موجود ہے۔ ان میں چند مدارس اچھی خدمات انجام دے رہے ہیں، مگر ہماری ہونے والی پود اور دینی مدارس کے نو آموز نوجوان تعلیمی انتشار اور بدنظمی کے موجب ہو رہے ہیں۔ وہ دیہات میں چھوٹے چھوٹے مدارس کھول رہے ہیں، جن کا نہ صرف یہ کہ باہم ربط نہیں بلکہ رقابت ہے، باہم آویزش ہے۔ تعلیمی ترقی کے بجائے یہ مدارس معاشی جنگ کی آماجگاہ بن گئے ہیں۔ یہ حضرات جماعت کی جیب پر بوجھ ہیں۔ اور باہم رقابت اور بدنظمی کی وجہ سے مضر ثابت ہو رہے ہیں۔"

اسی طرح مشرقی پاکستان میں مولانا مرحوم نے اپنی تقریر میں فرمایا:

"تعلیم کو منظم ہونا چاہیے۔ چھوٹی درس گاہوں کا تعلق بڑی جامع یا کلیہ سے ہونا چاہیے۔ نصاب میں توازن ہونا چاہیے۔ طلبہ کی نقل و حرکت پر پابندی ہونی چاہیے۔ سرٹیفکیٹ کے سلسلہ میں انھیں پابند کر دینا چاہیے۔ صحیح طور پر یہ نظام اس وقت چل سکتا ہے کہ حکومت اس ذمہ داری کو عقیدت اور ہمدردی کے جذبات سے سنبھالے۔"[1]

مولانا اسماعیل مرحوم و مغفور نے موجودہ دینی مدارس کی بدنظمی اور مضرت رسانی کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"ان میں کوئی باقاعدہ نظام نہیں۔ طلبہ کی نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں۔ مدارس تعلیم کے بجائے آوارگی کی درسگاہ

---

[1] یہ دونوں اقتباسات جمعیت اہل حدیث کے آرگن الاعتصام سے ماخوذ ہیں۔

بن گئے ہیں۔ سالہا سال صرف کرنے کے باوجود جو لوگ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں، وہ ملت کے لیے کوئی خدمت سرانجام نہیں دے سکتے۔ لیکن بعض اوقات انتشار اور تفریق بین المسلمین کا موجب بنتے ہیں۔"

مختصراً اس وقت دینی مدارس کی یہ حالت ہے اور اس پر مزید یہ کہ یہ روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ خود دینی و عربی مدارس والے اپنی اصلاح کریں۔ یہ تجربہ گذشتہ اسی سال سے ہو رہا ہے اور اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور نہ تو اور ہمارے علما کو بھی اس ضرورت کا زیادہ احساس نہیں، اور نہ انھوں نے اس کی طرف کبھی توجہ کی ہے۔

آخر محکمہ اوقاف مغربی پاکستان ہی کو اس عظیم ملی کام کو اپنے ہاتھ میں لینا پڑا اور اس کی کوششوں سے بہاولپور میں جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔

اکتوبر ۶۳ء میں صدر پاکستان نے جامعہ اسلامیہ بہاولپور کا باقاعدہ افتتاح کیا اور گورنر مغربی پاکستان کے خصوصی حکم سے اس کی قانونی حیثیت متعین کی گئی۔ اس حکم کے تحت اسے یہ اختیارات دیے گئے کہ جو عربی و دینی مدارس اور دار العلوم جامعہ اسلامیہ سے منسلک ہونا چاہیں، انھیں اپنے ساتھ ملحق کرے، اپنے فارغ التحصیل طلبہ کو ڈگریاں اور ڈپلومے دے۔ تعلیم و تدریس اور اسلامی علوم میں ریسرچ کا خاطر خواہ انتظام کرے نیز ائمہ اور خطبا کو تربیت دے۔

۱۹۶۵ء کے شروع میں جب جامعہ اسلامیہ کا آرڈی ننس مغربی پاکستان اسمبلی میں پیش ہوا تو سرکاری بنچوں کے علاوہ حزب اختلاف نے بھی جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے قیام کا بڑے زور دار الفاظ میں خیر مقدم کیا اور اس طرح یہ آرڈی ننس باتفاق رائے منظور ہوا۔ دینی تعلیم اور دینی مدارس کے روز افزوں انتشار و بدنظمی کو دیکھتے ہوئے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، محکمہ اوقاف کا یہ اقدام کتنا ضروری، مفید اور دور رس اثرات کا حامل ہے، اس کا اعتراف ہر شخص کرتا ہے۔

محکمہ اوقاف کے اس تاریخی اقدام کی نہ صرف پاکستان میں بلکہ ہندوستان کے علما کے حلقوں کی طرف سے بھی تعریف کی گئی۔ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب مرحوم و مغفور کے صاحبزادے سید محمد ازہر شاہ صاحب نے جامعہ اسلامیہ کے مجوزہ نصاب تعلیم کے بارے میں بعض ضروری مشورے دیے اور اس سلسلے میں دار العلوم دیوبند کے ماہنامہ "دار العلوم" میں تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے اس کا ان الفاظ میں خیر مقدم کیا: "مغربی پاکستان کی سابق مسلمان ریاست بہاولپور میں "جامعۂ عباسیہ" ایک پرانی درس گاہ تھی۔ اب "جامعۂ اسلامیہ"

کا نام دے کر نئے انتظامات اور نئے ارادوں کے ساتھ جدید شکل دی گئی ہے۔ نئے انتظامات کے ماتحت جامعہ نے اپنا نیا نصاب تعلیم مقرر کیا ہے۔ جس میں قدیم و جدید علوم کو باہم جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جامعہ نے اپنی تعلیم و انتظامات کا جو خاکہ شائع کیا ہے، اگر یک سوئی اور شغف و محنت کے ساتھ اس خاکہ میں عملی رنگ بھرنے کی کوشش کی گئی اور جامعہ کے ارباب انتظام نے مسلمانوں کی نئی نسل کی تعلیم و تربیت سے متعلق اپنے فرائض کو محسوس کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس جامعہ کے فضلا قدیم و جدید علوم کے جامع اور ملت اسلامیہ کی موجودہ نسل کے نبض آشنا نہ بن سکیں ..... جامعہ اسلامیہ بہاولپور جن مقاصد کو لے کر سامنے آئی ہے' وہ پوری ملت اسلامیہ کے لیے باعث مسرت ہے۔ جن چیزوں کی کمی بری طرح کھٹکتی تھی، پاکستان میں بہاولپور نے ان کی تلافی کے لیے جس عزم کے ساتھ قدم اٹھایا ہے، اس کے لیے ارباب جامعہ مستحق مبارک باد ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے حوصلوں میں بلندی، ارادے میں پختگی، اور عمل میں سرگرمی عطا فرمائیں۔

ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی ہر مسلمان فرقے کی اپنی الگ الگ درس گاہیں ہیں۔ جب کہ ایک مخصوص فرقے کے مختلف علمانے بھی اپنے الگ الگ مدرسے بنا رکھے ہیں۔ اس کا سب سے نقصان یہ ہے کہ ایک تو اس کی وجہ سے فرقہ وارانہ تعصبات کی پرورش ہوتی ہے۔ دوسرے ہر عالم کی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بن جاتی ہے اور اس سے اجتماعیت کی بجائے انفرادیت کو فروغ ملتا ہے۔ اس کے برعکس جامعہ اسلامیہ بہاولپور اہل سنت کے سب مکاتب فکر کی مشترکہ درس گاہ ہے اور اس میں سب مکاتب فکر کے اساتذہ بھی ہیں اور طالب علم بھی۔ ہماری دینی تعلیم کی دنیا میں ایک یہ نئی بات ہے اور یہ اتحاد بین المسلمین کے لیے ایک ضروری شرط ہے۔ مقلدین اور غیر مقلدین کا نزاع تو چلا ہی آرہا ہے، خود مقلدین اور ایک ہی فقہی مذہب کے مقلدین میں باہم جو اختلاف پایا جاتا ہے، جس نے بعض جگہوں میں منافرت کی صورت اختیار کرلی ہے اس کا علم کسے نہیں۔ جامعہ اسلامیہ میں ان اختلافات کو اس طرح کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ سب لوگ ایک علمی ماحول میں رہیں۔ ان میں باہمی ربط و ضبط پیدا ہو۔ اور وہ ایک دوسرے کے نقطہ ہائے نظر سے واقف ہوں۔ جامعہ اسلامیہ میں فکری ہم آہنگی، باہمی رواداری اور اسلامی وحدت پیدا کرنے کی خاص طور سے کوشش کی گئی ہے۔